پروفیسر غازی علم الدین

# اُردو کا مِلّی تشخص اور کردار

زبان اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے (۱)۔ انسانی شخصیت میں یہ ایک اہم مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان نہ ہوتی تو نہ شعر ہوتا نہ فلسفہ، نہ سائنس ہوتی نہ نت نئی ایجادات، نہ انسان صحیح معنوں میں خدا کو پہچانتا نہ خود اپنی انسانی نسل کے بھائیوں اور بہنوں کو۔ یہ حقیقت ہے کہ اچھی زندگی ہمیں زبان کے طفیل نصیب ہوئی ہے۔ قوتِ تکلّم انسانی شرف کا ایک امتیازی وصف ہے۔ یہ قوّت اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ بعض اوقات اسے واحد امتیازی وصف کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ نطق یعنی قوت گویائی انسان اور حیوان کی ہم نوعی کے باوصف واحد وجہِ امتیاز قرار پاتی ہے۔ زندہ انسان اور زندہ زبان میں اس قدر قریب کی مشابہت ہے کہ کسی زبان کو "زندہ" یا "مردہ" کہنا مجازی طور پر ہی نہیں، لغوی طور پر بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ مسلسل حرکت اور رنگا رنگی میں بھی یہ دونوں ایک دوسرے کے مثیل ہیں۔ قوّت تکلّم کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہر مذہب نے اس کی تہذیب و اصلاح کو اپنی تعلیمات کا حصہ بنایا ہے۔ اسلام ہمہ گیر راہ نمائی کا مدّعی ہے اس لئے قوتِ اظہار کے اس شرف پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ذکرِ الٰہی جو قلب و نظر کا اطمینان (۲) ہے زبان ہی کا وظیفہ ہے اور "حَصَائِدِ اَلْسِنَہ" (۳) اسی قوتِ اظہار کے غیر مناسب استعمال کو کہا گیا ہے۔

جس طرح انسان ابتداء ہی سے اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات پر غور و فکر کر رہا ہے اسی طرح اس کے اندر پھیلی ہوئی کائنات بھی اس کی توجہ کا مرکز ہے جس کے عجائبات گونا گوں اور اسرار لامتناہی ہیں۔ زبان بھی انہی اسرار میں سے ایک ہے۔ یہ بنیادی سوالات ہمیشہ ہی سے

موضوعِ بحث رہے ہیں کہ روئے زمین پر انسان کب سے آباد ہے اور کیا انسانی زبان کی اصل ایک ہی ہے؟ اس کی ابتداء کیسے ہوئی اور کیسے پھیلی؟ او پھر اس میں تغیرات کس طرح سے آ ئے؟ زبانوں کے کتنے خاندان ہیں اور کون کون سی زبانیں کس کس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں؟ لہجے کیسے وجود میں آئے، معاشرہ کا زبان پر اور زبان کا معاشرہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟ معاشرے کے مختلف طبقات کی زبانوں میں فرق کی نوعیّت کیا ہے؟ انسانی زبان اور فکر کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

زبان کے عناصرِ ترکیبی کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

> ''زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے، قوم کا ملکی استقلال، سلطنت کا اقبال، اس کا مذہب اور تعلیم و تہذیب۔ اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں سے قائم ہیں تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ ایک یا زیادہ جتنے کمزور ہوں گے اتنی ہی زبان ضعیف ہوتی جائے گی یہاں تک کہ مر جائے گی۔''(۴)

ہر زبان کے ساتھ متعلقہ قوم کی تہذیب وتمدن اور تاریخ و روایات وابستہ ہوتی ہیں۔ ہر ملک کی قومی زبان اس کے قومی تشخص کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ قومی زبان اور قومی تشخص میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اردو زبان و ادب کے ملّی تشخص اور کردار کی نسبت جائزہ لیا جائے گا۔ اس تحریر سے میری یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ اردو کے فروغ وا شاعت میں صرف اور صرف مسلمانوں نے ہی کام کیا ہے اور دوسری قوموں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ رتن ناتھ سرشار، مالک رام، نول کشور، منشی پریم چند، ہری چند اختر، تلوک چند محرومؔ، پنڈت دیا شنکر نسیم، سری رامؔ، چکبست، کرشن چندر، رام بابو سکسینہ، منشی تیرتھ رام فیروز پوری، دیوان سنگھ مفتون، فراق گورکھپوری، گیان چند، آنند نرائن ملّا، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مسز سروجنی نائیڈو کی اردو زبان و ادب کے

بارے میں خدمات سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟ لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں تمام قوموں سے بڑھی ہوئی ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسری قوم نے اس زبان کو من حیث القوم نہیں اپنایا کیوں کہ ان کے پاس وسیلۂ اظہار کے لئے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں جنھیں انھوں نے وقتاً فوقتاً استعمال بھی کیا ہے لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم ہندوستان کی سینکڑوں زبانوں میں سے صرف اسی ایک زبان پر قناعت کی اور اپنے خیالات کے اظہار کا واحد، بھرپور اور مؤثر وسیلہ بنایا۔

اسلام ایک طریقِ حیات ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ عربی زبان اسلامی احکامات کی امین ہے۔ اس لئے اس میں زندگی کے تمام شعبوں کے لئے کلمات و مفردات کا ایک بحرِ زخار موجود ہے۔ جس نسبت سے یہ کلمات برصغیر کی مقامی زبانوں میں داخل ہوتے گئے اُسی نسبت سے ان کا عربی زبان سے قرب بڑھتا گیا۔ یہ اس اثر پذیری کا نتیجہ تھا کہ مقامی زبانوں میں عربی زبان کا لسانی بُعد ختم ہونے لگا اور آخر وہ وقت آیا کہ مسلم ہند کی زبان بھی مشرف بااسلام ہوگئی۔ اردو جو اسلامی ثقافت کی زندہ مثال ہے، عربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ عربی زبان نے اردو کی ساخت و پرداخت میں مادرانہ کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے علاوہ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، بنگلہ، کھڑی بولی اور دیگر تمام زبانوں کا اِحصاء کیا جائے اور ان کے مفردات کا مآخذ تلاش کیا جائے تو سینکڑوں نہیں ہزاروں الفاظ عربی الاصل نکلیں گے۔ عربی زبان و ادب سے رابطے اور دینِ اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں کثیر تعداد ان علماء و ادباء کی سرگرمِ عمل نظر آتی ہے جو برصغیر کی کوکھ سے پیدا ہوئے مگر عرب تہذیب و تمدن کو اپنانے لگے اور دینِ اسلام کی تشریح و توضیح میں اپنی زندگیوں کو وقف کیے رہے۔ یہ ان اربابِ علم کی محنت کا ثمر ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے عوام اپنے دین سے محبت کرنے والے ہیں اور تہذیبی و تمدنی اقدار کے حوالے سے اپنے عرب بھائیوں سے بہت قریب ہیں۔‘‘(۵)

برصغیر پاک و ہند میں ہزار سالہ اسلامی حکومت کا سب سے اہم اور عظیم الشان کا رنامہ مقبولِ عام زبان اردو کی تشکیل ہے۔ اردو کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی حیثیت متعیّن کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''اردو ہماری گزشتہ عروجِ عظمت کی تنہا یادگار یا سوگ وار ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف اردو کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی تمام تدریجی اور ارتقائی منازل میں انھیں کا ذہن و دماغ کارفرما رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی معاشرت، ان کی ذہنی اور دماغی ترقی کی تنہا حامل ہے۔ کسی قوم کی زبان اس کی قومی حیثیت کی علم بردار ہوتی ہے۔ کسی قوم کے اوّلیں آثارِ انحطاط کا مطالعہ کرنا ہو تو اس قوم کی زبان پر نظر ڈالیے۔ آپ پر یہ حقیقت جلد منکشف ہو جائے گی کہ قومی زوال کی ابتداء ہمیشہ زبان کے زوال سے ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اثر سے تشخصاتِ ملّی تک فنا ہو گئے ہیں۔''(۶)

برصغیر کی زبانوں پر عربی و فارسی زبانوں کے براہِ راست اثرات اسی وقت سے شروع ہو گئے تھے جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ ان زبانوں میں رفتہ رفتہ عربی و فارسی کے الفاظ غیر شعوری طور پر داخل ہونے لگے جن کے وجود کا علم ہمیں اس وقت کے دیسی ادب کی ورق گردانی سے ہوتا ہے۔ ان اثرات کو قبول کرنے میں اردو زبان بھی اپنی دوسری معاصر زبانوں کے برابر کی شریک تھی۔ برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں نے جب اردو کو اپنے لئے چن لیا تو اس میں عربی و فارسی کے دخیل الفاظ کا حصہ بھی زیادہ ہو گیا۔ مسلمان اپنا ایک جداگانہ مذہبی نظام اور ایک مخصوص فلسفۂ حیات لے کر آئے تھے اور اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے خاص الفاظ اور اسالیب بیان کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم و عبادات وغیرہ کے لئے توحید، رسالت، صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، نماز اور روزہ جیسی کثیر تعداد اصطلاحات کا ذخیرہ بھی رکھتے

تھے جسے انھوں نے اردو زبان میں بجنسہٖ منتقل کردیا۔ اس سے جہاں اردو بولنے والے مسلمانوں کو اپنی مذہبی تعلیم و تبلیغ میں مدد ملی، وہاں اردو زبان کا دامن بھی وسیع ہوگیا۔(۷)

برصغیر کے مسلمانوں کی اپنی سماجی زندگی کا ایک خاص نہج تھا اور زندگی کے کچھ رسوم و رواج اور کچھ تقاضے بھی تھے۔ پیدائش، شادی بیاہ اور موت کی تقریبات، ختنہ، عقیقہ اور نذر نیاز کے طریقے اور نشست و برخاست کے قرینے تھے۔ وہ بعض ایسے کھانے کھاتے آئے تھے، بعض ایسے لباس پہنتے آئے تھے اور بعض ایسی اشیاء (ظروف اور فرنیچر وغیرہ) استعمال کرتے آئے تھے جن کی وضع قطع اور جن کے نام ہندوستان کے لئے بالکل نئے تھے۔ بعض ایسے قصے اور بعض ایسے واقعات کی یادیں تھیں جو ان کے ماضی اور وطنِ قدیم سے متعلق تھے اور جن سے اردو زبان اب تک بالکل ناآشنا تھی، اس لئے ان کے یہ سب نام اور یہ سب تلمیحات انھیں جوں کی توں اس زبان کے سپرد کرنا پڑیں تاکہ وہ ان کی یومیہ زندگی کی بھرپور کفالت کرسکے اور ان کے خواب اور بیداری کی مکمل طور پر امین بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی اور ترجمانی کی اہل بنانے کے لئے اردو زبان کو عربی و فارسی کے کثیر تعداد الفاظ، اصطلاحات، محاورات، تلمیحات اور اسالیبِ بیان عطا کردیے۔ یہ بات صرف اردو زبان تک ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ ان کوششوں کا سلسلہ اردو ادب تک بھی پہنچا اور وہ اس طرح کہ عربی و فارسی کا تمام عروض اردو میں منتقل کرلیا گیا۔ عربی و فارسی زبان کی تمام بحریں اردو نظم میں استعمال کی گئیں۔ مختلف اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ کا اضافہ کیا گیا۔ شعری تنقید کا انداز مستعار لیا گیا۔ اصلاحِ زبانِ اردو کی جو کوششیں آج تک اساتذۂ اردو نے کی ہیں ان میں دیسی الفاظ کو کم کرنے اور عربی و فارسی الفاظ کو رائج کرنے پر پوری قوت صرف کی گئی۔ عربی و فارسی محاورات کا ترجمہ کرنے کی کوشش تو بہت سے شاعروں نے کی ہے۔ یہ سب کچھ اردو کو اس برصغیر میں عربی و فارسی کے حقیقی جانشین بنانے کے لئے کیا گیا کیوں کہ مسلمانوں کو ان زبانوں سے پیار ہے۔ مسلمانوں نے اردو کو اپنانے کے لئے

عربی و فارسی میں موجود قریب قریب پورا مذہبی سرمایہ اس زبان میں منتقل کردیا۔ مسلمان علماء نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا اور تفاسیر لکھیں۔ قرآن و حدیث، فقہ، سیرت، تصوف، اسلامی فلسفے اور تاریخ کے سرمائے کو اردو میں منتقل کیا۔ سیرت پاک پر سینکڑوں کتابیں اردو میں لکھی گئیں۔ بزرگانِ دین کی سوانحِ عمریاں اور مسلمانوں کی تاریخیں نہ صرف ترجمہ ہوئی ہیں بلکہ اردو میں بھی خود نئے سرے سے لکھی گئی ہیں۔ اس قدر وافر مذہبی سرمائے کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اردو زبان کو اپنے لئے منتخب کرکے اپنی پوری کی پوری متاعِ عزیز اسے سونپ دی ہے۔(۸)

اردو زبان اپنی خصوصیات کی بنا پر جس درجہ ممتاز ہے اس کی مثال برصغیر پاک و ہند کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کرسکتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دیسی زبانوں میں سے اردو ہی وہ اکیلی زبان تھی جسے اکبر راج میں اس کے محل والوں نے اپنا لیا تھا، جسے شاہ جہان نے ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچادیا تھا اور جسے ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے فارسی کی جگہ سرکاری زبان بھی بنادیا تھا۔ یہی زبان آج پورے برصغیر کی لمبائی چوڑائی میں سب زبانوں سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس میں جتنا اسلامی ادب موجود ہے اتنا عربی و فارسی میں بھی مشکل سے مل سکے گا۔ اردو میں جو کچھ مواد اسلامی علوم اور عربی و فارسی زبان وادب سے متعلق موجود ہے اس کی تہ میں مسلم ہند کی تاریخ اور تہذیب کے معتبر شواہد ملیں گے۔ مسلمانوں کے قیامِ حکومت کے ساتھ ہی ہندوستان اسلامی علوم کا بڑا مرکز بن گیا۔ لاہور، ملتان، دہلی، گجرات اور لکھنؤ وغیرہ مراکز ایسے تھے جہاں ہندوستان اور بیرون ہند کے علماء وفضلاء علوم کی تحقیق و تدقیق میں مصروف ہوئے۔ یہ روایت صدیوں تک قائم رہی۔ اسی وجہ سے دہلی جو دارالسلطنت تھا، اس نے علمی اور تہذیبی ترقی کے اعتبار سے بغداد اور قرطبہ کو بھی دھندلا کردیا۔ یہاں کے علماء کی تصانیف کا معیار کسی بھی ملک کی تصانیف سے کم نہیں۔ یہاں کے علماء کی فکری روایت بیرونِ ہند علماء کی فکری روایت سے بہت مستحکم رہی ہے۔ گزشتہ دور کے چند صاحبِ فکر بزرگوں جن میں سرسیّد احمد خان، مولانا

شبلی نعمانی، مولانا حالی، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ ممتاز ہیں، ان کی تصانیف کا مقابلہ اسلامی ممالک کے کسی عالم کی تصانیف سے کرلیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی اسلامی تفکیر کا کیا مرتبہ ہے۔

اسلامی ہند میں اردو کے فروغ کے حوالے سے ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''نئی زبان (اردو) میں اس شدید قسم کی کشش تھی کہ اس نے جلد ہی عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ پھر مسلمان صوفیہ نے اس زبان کے ذریعے اسلام کو پھیلانا شروع کیا تو یہ اور بھی مقبول ہوگئی۔ یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک یہ ایک ادبی و علمی زبان کی حیثیت اختیار کرگئی اور ملک کے ہر صوبے اور ہر شہر میں سائنسی اور ادبی انجمنیں اردو کے نام سے کام کرنے لگیں لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں اردو کی یہ مقبولیت انتہاء پسند ہندوؤں کو انتہائی ناگوار گزری۔'' (۹)

زبان اور رسم الخط کا تعلق بھی روح اور قالب سے کم نہیں۔ رسم الخط تلفظ کا تابع ہوتا ہے اور اس کا ہر حرف ایک جداگانہ آواز کی نیابت کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتداءً زبان صرف اصوات کا نام ہوتا ہے اور اشکال ثانوی حیثیت رکھتی ہیں لیکن حروف یعنی الفاظ کی تحریری شکلیں بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہیں جتنی کہ ان کی آوازیں۔ زبان اور رسم الخط کا مکمل اور مناسب اجتماع و امتزاج زبان کو زندہ اور پائندہ بناتا ہے اس لئے کسی زبان کو اس کے رسم الخط سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ زبان رسم الخط کے بغیر مکمل نہیں ہوتی بلکہ ادھوری رہتی ہے۔ جس زبان کا اپنا رسم الخط نہ ہو اس کا دامن علم وادب کے خزانوں سے تہی رہ جاتا ہے۔ جس طرح روح اور جسم ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، بالکل اسی طرح زبان اور رسم الخط کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اردو اور اس کے رسم الخط سے ہمارا رشتہ بہت قدیم ہے۔ اردو صرف زبان کا نام ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت بھی ہے۔ برصغیر میں اردو ہندی تنازع کا اصل محرک رسم الخط کی تبدیلی

تھا۔ ہندو اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم الخط رائج کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے شان دار ماضی، معاشرتی روایات اور تہذیبی و ثقافتی سرمائے سے دست بردار ہونا پڑتا۔ اردو زبان کو قرآنی حروف کا لباس عطا کر دینے کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان بستے تھے وہ اپنے علاقے کی مقامی بولی بولتے ہوئے بھی اردو زبان کو اپنی تحریر کے لئے استعمال کرنے لگے کیوں کہ عربی رسم الخط سے مسلمانوں کی عقیدت بالکل فطری تھی۔ اس لئے اردو کا دائرہ اثر اس قدر وسیع ہوا کہ برصغیر کے گوشے گوشے میں اس کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پشاور سے ڈھاکا اور کشمیر سے راس کماری تک اس کے بولنے اور سمجھنے والے پیدا ہو گئے۔ چناں چہ اردو کی نشر و اشاعت میں اسلامیانِ ہند کی کوششوں کو جتنا دخل ہے اس سے اردو زبان کا کوئی مؤرخ انکار نہیں کرسکتا اور نہ اس حقیقت کو چھپا سکتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال پر مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اطرافِ ہند میں اردو زبان کے مختلف مراکز قائم ہوئے جن سے رفتہ رفتہ ترویجِ اُردو کی صوبہ جاتی تحریکوں نے جنم لیا اور کُل ہند انجمن ترقیٔ اردو کے علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ (۱۰)

اردو رسم الخط اپنی ایک مبسوط تاریخ رکھتا ہے۔ رسم الخط قوموں کے لسانی مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس سے ایک قوم کے مخصوص تہذیبی نقوش کا پتا چلتا ہے۔ زبان اور رسم الخط کی اہمیت اس حوالے سے دو چند ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں (زبان اور رسم الخط) قوموں کی تہذیبی اساس کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کا سبب ہیں۔ تہذیب و ثقافت کی تشکیل و تزئین اور فروغ و ارتقاء میں زبان کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ ہر رسم الخط صوتی ادائی کا عکاس ہوتا ہے۔ اس کی معرفت ہی سے آوازیں ادا ہو سکتی ہیں۔ موجودہ رسم الخط عربی و فارسی اور اردو کی آوازوں کا آلۂ اظہار ہے۔ اردو کا موجودہ رسم الخط دنیائے اسلام کا رسم الخط ہے جس سے ہمارے دینی رشتوں کی اساس مضبوط ہوتی ہے۔ اردو رسم الخط دل آویز ہے جو ایجاد اور اختراع کے نئے نئے پہلوؤں سے مزین ہے۔ اس میں تخلیقی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس رسم

الخط کو اس کے لکھنے والوں نے اپنی جدّتِ طبع اور رنگینیٔ قلم سے مصوّری کا درجہ عطا کر دیا ہے۔

جب تک اردو زبان دیوناگری میں قلم بند ہوتی رہی، ہمالیہ کی فصیل پار نہ کر سکی لیکن عربی و فارسی رسم الخط میں منتقل ہونے کی دیر تھی کہ اسے ہندوستان کی سرحدوں کو پھلانگ کر ایران و عربستان کی زبانوں اور ان کے بولنے والوں سے تعارف و ملاقات کا موقع بھی ہاتھ آ گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دیوناگری کے حصارِ آہنی میں قید رہنے والی زبان کو مسلمانوں کی بدولت آزادی نصیب ہوئی اور اُسے وہ پرِ پرواز مل گئے جن کے زور پر وہ آج دنیا کی زبانوں میں تیسرے نمبر پر شمار ہونے لگی ہے۔ چناں چہ ہندوستان سے باہر اردو کی ترویج و اشاعت بھی اس کے قرآنی رسم الخط کا ہی اعجاز تھا جس کے احسان سے یہ زبان تا قیام قیامت سبک دوش نہیں ہوسکتی (۱۱)۔

فورٹ ولیم کالج وہ واحد ادارہ تھا جہاں سب سے پہلے پنڈت للولال جی نے اردو ہندی تنازع کا آغاز کیا۔ انگریزوں کی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' اُن کے روزِ اوّل سے ہی کارفرما تھی۔ چناں چہ آہستہ آہستہ انگریز نے نسلی، لسانی، مذہبی، فرقہ جاتی اور علاقائی تعصّب کو بھڑکایا اور خاص طور پر علیحدہ خطہ، تہذیب و ثقافت اور تمدّن و کلچر کے موضوع پر کتابیں لکھوائیں جنھوں نے ان تمام قسم کے تعصّبات کو بھڑکانے میں شعلۂ جوالہ کا کام کیا۔ ہندی زبان کو فورٹ ولیم کالج نے خاص وجوہات کی بنا پر ترتیب دیا۔ مشرقی زبانوں کے شعبے میں عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو شامل تھیں۔ ڈاکٹر جان گِل کرِسٹ اس کے صدر تھے۔ برطانوی افسروں کو مقامی زبان کی تعلیم کے لئے مصنفین اور مترجم مسلمان اور ہندو تھے۔ یہ کتابیں فارسی رسم الخط (نستعلیق) میں شائع کی گئیں۔ ایک ہندو مترجم للولال جی نے، جو گجرات کا برہمن تھا، بھگوت گیتا کا ترجمہ ''پریم ساگر'' کے نام سے کیا لیکن اس میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ فارسی اور عربی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ برج بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ شامل کیے گئے اور فارسی رسم الخط کی بجائے دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا۔ اس کام پر مصنف کی بہت تعریف کی گئی کیوں کہ اس

طرح ایک نئی زبان، جسے ہندوؤں کی زبان کہا جا سکے، کا راستہ کھل گیا تھا۔ ''پریم ساگر'' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا اور بعد میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس نئی طرزِ تحریر کا، جسے ہندی کا نام دیا گیا، پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''جدید ہندی کا اس وقت کوئی وجود نہ تھا کیوں کہ اس زبان میں پہلے کوئی لٹریچر نہ تھا۔ پہلی دفعہ اسے بطور ادبی زبان کے استعمال کیا گیا تھا۔ کالج کے پروفیسروں نے للولال جی کی اس زبان میں، جس میں اردو لکھی جاتی تھی، کتابیں لکھنے کی حوصلہ افزائی کی۔ البتہ اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی جگہ سنسکرت الفاظ استعمال کیے گئے ۔ یہ نئی زبان ہندوؤں کی ضرورت کے مطابق خیال کی گئی ۔ پھر اس میں عیسائی مشنریوں نے بائبل کا ترجمہ کر کے اسے مقبول بنایا۔ نیا انداز جسے ہندی کہا گیا اسے مقبول ہونے میں کافی عرصہ لگ گیا۔ درحقیقت جدید ہندی ۱۸۵۷ء کے بعد ہی اس قابل ہو سکی کہ لوگ اس پر توجہ دیں۔ صوبائی گورنر لوگوں کو اردو زبان کے استعمال سے منع کرتے اور ہندی کی ترغیب دیتے کیوں کہ برطانوی حکومت ہندی کی ترویج میں بہت دل چسپی رکھتی تھی۔ اس طرح ہندی کے فروغ سے ہندو قومیت کو تقویت ملتی تھی۔''(۱۲)

ہندوؤں کو اردو زبان اس لئے گوارا نہ تھی کہ اس کا ظاہری پیکر فارسی اور عربی تھا اور وہ مہاتما گاندھی کے بقول قرآن کے حروف اور اسلوب کا مالک تھا۔ یہ بات تکلیف دہ تھی کہ اردو ابجد کی شکل قرآن کی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ قرآن کے آثار باقی اور جاری رہنا گویا مسلمانوں کو باقی رکھنے کی گنجائش پیدا کرنا تھا۔ شیخ محمد اکرام ہندوؤں کی اردو سے مخالفت اور ناگواری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''زبان و ادب کے معاملات میں بھی ہندوتہذیب کے احیاء کے حامیوں کا رویہ اس سے کم امتیازی نہیں رہا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں 'فورٹ ولیم کالج' میں للولال جی اور اُن کے ساتھیوں نے نئی ہندی اس طرح ''پیدا'' کی کہ اردو زبان سے تمام عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیے اور سنسکرت اور ہندی مآخذ کے الفاظ شامل کرلیے ۔(۱۳) یہی وہ رویہ تھا جس نے ان عوامل کو جنم دیا جس کا نتیجہ ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مہاتما گاندھی جیسے نام ور انسان بھی اردو کی ثقافتی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ ۱۹۴۰ء میں ناگ پور میں ہندی ساہتیہ سملین کے اجلاس میں انھوں نے کہا ''اردو کو مسلمان بادشاہوں نے ترقی دی۔ اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس کی پرورش کریں''۔(۱۴)

اردو ہندی تنازع کے پسِ پردہ کئی مقاصد تھے۔ یہ تنازع بیک وقت مسلمانوں کے مذہب اور ثقافت پر ادبی میدان میں ایک بھرپور حملہ تھا۔ عربی کے الفاظ کے اخراج سے مسلمانوں کے مذہب کو نقصان پہنچانا مقصود تھا اور فارسی الفاظ کو خارج کرنے سے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور ادب برائے زیست کو برصغیر سے رخصت کرنا مقصود تھا۔ مسلمانوں کی تہذیب کو ختم کرکے ہندوتہذیب وثقافت کو فروغ دے کر سیاسی بالادستی حاصل کرنا تھا۔ رسم الخط کے بدلنے سے مراد مسلمانوں کو جہالت کی تاریکیوں میں دھکیلنا مقصود تھا کہ وہ فکری طور پر منجمد ہوجائیں۔ اردو برصغیر میں مسلمانوں کی ثقافت کی زبان تھی۔ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی ۔اس کا ارتقاء برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور قیام کا مرہون منت تھا۔ یہ آہستہ آہستہ ترقی کرکے پورے برصغیر میں رابطے کی زبان کی حیثیت اختیار کرگئی۔ جب یہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ان کے لئے بھی اسے رابطے کی زبان تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ چناں

چہ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی جگہ اردو کو عدالتی زبان بنا دیا گیا۔ گویا یہ اقدام مسلمانوں کی ثقافتی اور سیاسی حیثیت کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ یہ بات ہندوؤں کو پسند نہ آئی۔ ہندوؤں نے دیکھا کہ انیسویں صدی کے پہلے ربع میں شاہ عبدالقادر دہلوی کے اردو زبان میں سادہ ترجمۂ قرآن کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تو وہ جل بھُن گئے۔ بنگال اور بہار میں تبلیغی، اصلاحی اور علمی رسائل و کتب کی اشاعت پر وہ مزید سیخ پا ہو گئے۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اردو کے ذریعے مسلمان اپنے دین اور اپنی روایات کے تحفظ کا اہتمام کر رہے ہیں لہٰذا انھوں نے اردو کو بھی مسلمانوں کی طرح ملیچھ قرار دے دیا۔

۱۸۶۷ء میں یو پی کے ہندوؤں نے اردو کے خلاف تحریک چلائی اور مطالبہ کیا کہ اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے اور دیوناگری رسم الخط کو سرکاری حیثیت دی جائے۔ اس تحریک کا بنیادی محرک اردو دشمنی اور ہندو ثقافت کی بالا دستی منوانا تھا۔ سرسیّد احمد خان کے لئے یہ صورتِ حال پریشان کن ثابت ہوئی۔ سرسیّد ابتداء میں متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو خوب صورت دوشیزہ کی دو آنکھیں سمجھتے تھے لیکن ۱۸۶۷ء میں بپا ہونے والے ہندی اردو تنازع نے ان کے خیالات میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ متحدہ قومیت کے مخالف اور دو قومی نظریے کے زبردست حامی اور مبلّغ بن گئے۔ انھوں نے ہندوؤں کے مستقبل کے ارادوں کو بھانپ لیا۔ چناں چہ انھوں نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ قوم ہیں، انھیں اپنے مستقبل پر غور کرنا چاہیے۔ ان کا تعلیمی پروگرام اسی فکر کی ایک کڑی تھا۔ معروف بھارتی مسلم دانش ور اور بھارتی پارلی منٹ کے سابق رکن ڈاکٹر رفیق زکریا لکھتے ہیں:

> ''ہندی اردو قضیہ دراصل ہندو اور مسلم دانش وروں کے مابین چھڑنے والی لڑائی تھی۔ اگر چہ بنیادی طور پر یہ ایک لسانی قضیہ تھا لیکن اس کی وجہ سے دونوں فریقوں کے جذبات اس حد تک مشتعل ہو گئے تھے کہ ان

کے مابین پائے جانے والے تعلقات پر شدید اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ مسلم سیاست پر اس کا نہایت ہی واضح اثر ہوا۔ اس کی وجہ سے وہ تمام تعلیم یافتہ مسلمان جو پہلے ہی سے نئی ابھرنے والی ہندو قیادت کے تعلق سے شکوک اور شبہات میں مبتلا تھے اس بار شدت کی ساتھ اپنے مستقبل کے تعلق سے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ سر سیّد احمد خان نے تو اس سے بہت پہلے ۱۸۶۷ء ہی میں اپنے اعلیٰ عہدے دار مسٹر شیکسپیئر سے کہہ دیا تھا کہ ہندی کی حمایت کرنے والے ہندوؤں کی اردو مخالف تحریک کے بعد ہی انھیں اس کا یقین ہوگیا تھا۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانب سے کسی مشترکہ عمل کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو خود ہی منظم ہوکر اپنے قومی اثاثے کی حفاظت کرنی ہوگی۔''(۱۵)

۷ر نومبر ۱۸۷۱ء کو گورنر بنگال نے بھاگل پور سائنٹفک سوسائٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس موقع پر مولوی امداد علی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے۔ بہاری تو پہلے ہی سے موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے گورنر کو 'غیر ملکی' زبان کی بجائے مقامی زبان کے اجراء کا مشورہ دیا۔ چناں چہ گورنر نے صرف اردو زبان کی مذمت کرتے ہوئے اسے ''غیر ملکی'' زبان قرار دیا بلکہ وہ اردو کو نقصان پہنچانے کے اس قدر درپے ہوگیا کہ اس نے محکمہ تعلیم کو اردو کی نصابی کتب کی ممانعت کا حکم جاری کر دیا۔ گورنر کے اس فیصلے کو حکومت کے دیگر اعلیٰ عہدے داروں نے ناپسند کیا۔ کلکتہ کے نیم سرکاری اخبار ''دی انگلش مین'' نے بھی گورنر کے اس فیصلے پر نقطہ چینی کی۔(۱۶)

۱۸۸۲ء میں ''ہنٹر ایجوکیشن کمیشن'' کی تشکیل کے موقع پر ہندوؤں کو دوبارہ اردو زبان کو نقصان پہنچانے کا موقع میسر آیا۔ اس بار یہ فتنہ پنجاب اور یوپی میں اٹھا جہاں انجمنوں اور

سوسائٹیوں نے کمیشن کو اردو کے خلاف لاتعداد میموریل پیش کیے۔ ایک مرتبہ پھر سرسیّد اردو زبان کی حفاظت کے لئے آگے بڑھے اور ہنٹر کمیشن کو یہ باور کرانے میں کام یاب ہوئے کہ یہ مسئلہ لسانی کی بجائے سیاسی رنگ اختیار کر چکا ہے۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں یوپی کے متعصب گورنر اینٹونی میکڈانل کو یوپی کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی اور ناگری رسم الخط کے اجراء کے متعلق ایک عرض داشت پیش کی گئی۔ میکڈانل مسلمانوں کے بارے میں سخت متعصب تھا اور اسے مسلمانوں سے غداری کی بو آتی تھی۔ اسی سبب اس نے گورنر جنرل کو لکھا کہ ''مسلمان برطانوی سلطنت کے لئے خطرہ ہیں اور ان کی سرکاری ملازمتوں میں مضبوط پوزیشن کو سیاسی طور پر جہاں تک ممکن ہو ختم کیا جائے۔'' لہذا اس نے مسلمانوں کو زک پہنچانے کی خاطر نہ صرف یوپی کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اردو کے علاوہ ناگری رسم الخط جاری کرنے سے متعلق ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو ایک حکم جاری کیا بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ آئندہ سے دفاتر میں مختلف آسامیاں پُر کرتے وقت صرف انھی لوگوں کو مقرر کیا جائے جو فارسی اور ناگری رسم الخط دونوں سے واقف ہوں۔ (۱۷)۔ اُردو دشمنی میں سر اینٹونی میکڈانل کی ہندوؤں سے ہم نوائی ہندوستان کے مستقبل، ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کی زبان، ثقافت اور علمی ورثے کے لئے خطرناک تھی۔ چناں چہ ''مسلم کرانیکل'' اس بارے میں یوں لکھتا ہے:

> ''یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ حالیہ برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائے جانے والے تعلقات میں کوئی شے کشیدگی کا اس قدر باعث نہیں بنتی جتنی کہ وہ فاش غلطی جو زبان کے مسئلے میں سر اینٹونی میکڈانل سے سرزد ہوئی ہے۔'' (۱۸)

یوپی کے مشہور متعصب وزیر تعلیم مسٹر سمپورنانند نے اپنی اردو دشمنی کا بڑا سبب یہ بتایا تھا کہ ''جب میں گھر گیا تو میری لڑکی نے بھگوان کے بجائے خدا کہا'' اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ''خدا کی طرح اور بہت سے الفاظ جو مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں

آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اردو زبان کے ذریعے ہندوؤں کے دماغوں میں داخل ہو گئے ہیں اوراس سے ان کے مذہبی عقائد کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے"۔(۱۹)

مسلم لیگ کے چوتھے اجلاس میں مسلمان نمائندوں نے یہ فریاد پیش کی کہ بمبئی کے ناظم تعلیمات نے مراسلہ جاری کیا ہے کہ پبلک کے سکولوں میں سے اردو کو الگ کر دیا جائے۔ اگر مسلمان اردو کی تعلیم جاری رکھنا چاہیں تو دینی تعلیم کی طرح اس کا اہتمام اپنے گھروں پر کریں۔ اس طرح گویا اعلان کر دیا گیا کہ ہندوؤں کا جس طرح اسلام سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح اردو سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ (۲۰)۔ بہار کے صوبے میں اردو میں تحریر کردہ عرضی عدالتوں میں قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ مسلمان وکلاء اور دیگر اکابر نے ایک التجائی مہم شروع کی جس کی تائید ۱۹۲۵ء کے سالانہ جلسہ مسلم لیگ میں کی گئی۔(۲۱)

۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارتوں کی تشکیل ہوئی تو تمام ہندو صوبوں کے وزراء اعلیٰ، برہمنوں کو بنا دیا گیا۔ اب یہ حال ہو گیا کہ ڈاک خانے والوں نے اردو میں تحریر کردہ منی آرڈر بھی قبول کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا اور اُن خطوط کو مکتوب الیہ تک پہنچانے سے انکار کر دیا جن پر اردو میں پتا لکھا ہوتا۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں کانگریسی وزارتوں کو ملک کے لئے ایک مصیبت قرار دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بندے ماترم، ودیا مندر سکیم اور کانگریسی جھنڈے کو قومی حیثیت دینے کے خلاف مسلمانانِ ہند کے نفرت انگیز جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> "مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کی سیاسی قوت کو تباہ کرنے کے لئے اردو کو مٹایا جا رہا ہے اور اس کے بجائے ایک ایسی زبان کو ہندوستان کے عوام کی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو سنسکرت کی آمیزش سے تیار کی گئی ہے۔"(۲۲)

کانگریسی وزارتوں کے دوران (۱۹۳۷ - ۳۹ء) مسلمانوں کے وجود، ثقافت اور زبان کو ختم

کرنے کی بھرپور عملی کوششیں ہوئیں۔ مسلمانوں کے دیہات پر ہندوؤں نے منظم حملے کیے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ دیہات جلادیے گئے۔ گھروں کو لوٹ لیا گیا اور پھر مسلمانوں پر جھوٹے مقدمات قائم ہوئے۔ انصاف کے دروازے ان پر بند کردیے گئے۔ مسلم پریس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ہندوؤں نے فیصلہ کرلیا کہ مسلمانوں کی ثقافتی زبان اردو کو ختم کردیا جائے۔ چناں چہ اردو کتابوں پر پابندی لگادی گئی۔ اردو سکولوں کو بند کیا جانے لگا۔ ایک طرف مسلمانوں کے ہر ثقافتی نشان کو مٹانے کی ہر ممکن عملی کوشش کی جارہی تھی جب کہ دوسری طرف ہندومت اور ہندو ثقافت کے ہر نشان کو ابھارنے کے لئے ہر ممکن قدم اٹھایا جارہا تھا۔ اس امر کی شدت کا احساس گاندھی کے اس بیان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> ''ہندوستان میں ہندو تہذیب کے ذریعے سوراج قائم ہوسکتا ہے۔ دھرم کی روشنی میں ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کو دنیا سے نابود کردیا جائے اور اس کی جگہ راشٹر دھرم کی تعلیم مسلمانوں کو دی جائے۔ میں مسلمانوں کی گولی سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتا ہوں تو ان کی زبان یعنی اردو سے جو برصغیر میں ان کی ثقافت اور تہذیب کی زبان ہے۔ اگر مسلمانوں کو ختم کرنا ہے تو پہلے ان کی زبان ختم کرو، ان کی ثقافت اور تہذیب خود بخود ختم ہوجائے گی۔'' (۲۳)

اس کے جواب میں قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے ببانگِ دہل فرمایا تھا:

> ''ہندو اسلامی ثقافت و تہذیب اور اردو زبان کو مٹانے پر تلے بیٹھے ہیں لیکن میں ان کو خبردار کرتا ہوں کہ ہم مرتے مر جائیں گے لیکن اسلامی تہذیب و ثقافت اور اردو زبان تباہ نہیں ہونے دیں گے۔'' (۲۴)

پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس کے لئے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی

خاطر مسلم ماس کانٹکٹ (مسلم رابطہ عوام) کا شعبہ قائم کیا اور اعلان کر دیا کہ اب کانگریس جناح سے کوئی بات چیت نہیں کرے گی اور اس کے بجائے وہ براہ راست مسلمان عوام کے پاس جائے گی اور انھیں بہلا پھسلا کر، ورغلا کر اور بہکا کر اپنے حلقے میں کھینچ کر لے آئے گی (۲۵)۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پنڈت نہرو نے ہندوستان کی تمام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو ذیل کا گشتی مراسلہ بھیجا۔ اس میں سے ایک اقتباس بطور حوالہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ہندوؤں کی اردو دشمنی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

''اس سلسلہ میں ایک اور ضروری گزارش کرنا چاہتا ہوں ۔ ہمارے مرکزی دفتر میں اکثر شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ کانگریس کے جلسوں کے اشتہار عموماً اردو میں شائع نہیں کیے جاتے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگریس کے جلسوں، جلوسوں کی اطلاع نہیں ہونے پاتی۔ یہ شکایت بالکل درست ہے ۔مہربانی فرما کر اپنے صوبے کی ضلع وار اور مقامی کانگریس کمیٹیوں کو سخت ہدایت کر دیجئے کہ آئندہ اردو میں بھی اشتہار شائع کریں۔ بالخصوص پنجاب، یوپی اور دہلی کے صوبوں اور ہندوستان کے دیگر بڑے بڑے شہروں میں اس قاعدے کی پابندی بے حد ضروری ہے۔'' (۲۶)

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اردو کو پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتے تھے۔انھیں اردو کی اہمیت اور قوت کا اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پاکستان اور اردو زبان، دونوں کا مقدمہ بیک وقت لڑا۔ مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اردو دوستی کا حق خوب ادا کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۳۶ء میں اردو کانفرنس منعقد کی اور باصرار علامہ محمد اقبال کو شرکت کی دعوت دی۔ علامہ بیمار تھے۔آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہو گیا تو ان شاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانیے کہ اس اہم

معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔"

اسی طرح اپنے ایک اور خط میں علامہ اقبال نے بابائے اردو کو انجمن ترقی اردو کی بابت لکھا تھا:

"آپ کی تحریک سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اعتبارات سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتداء سرسیّد احمد خان نے کی تھی۔" (۲۷)

ہندوؤں کی اردو سے مخالفت نے سرسیّد احمد خان اور دیگر اکابر سے مسلمانوں کے لئے کئی تعلیمی ادارے قائم کروائے۔ ۱۸۷۵ء میں سرسیّد نے علی گڑھ میں ایک سکول کی بنیاد رکھی جسے ۱۸۷۷ء میں کالج کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ سرسیّد کا یہ کارنامہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں سرسیّد نے محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس نے سرسیّد کے کام کو اور آگے بڑھایا۔ نواب عبداللطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ میں قائم کی۔ اس طرح پنجاب میں انجمن حمایت اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ سندھ میں حسن علی آفندی نے سندھ مدرسۃ الاسلام قائم کیا۔ پشاور میں سرسیّد کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہوکر اسلامیہ کالج پشاور قائم کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں نواب محسن الملک نے ایک تقریر میں زور دے کر کہا کہ مسلمانوں کے تمدن کی حفاظت کا جذبہ تقاضا کرتا ہے کہ اُن کی کوئی سیاسی تنظیم ہو۔ ۱۹۰۶ء میں ان کا یہ خواب پورا ہوگیا۔ گویا اردو ہندی تنازع مسلم لیگ کی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ (۲۸)

ہندوؤں نے اردو کو مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کی نشانی سمجھا۔ وہ اسے صرف مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کردیا تھا۔ یہ لسانی جھگڑا ہندو مسلم جھگڑے ہی کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت میں ہندی کو رانی اور اردو کو باندی

بنادیا گیا جس سے ہندوؤں کا مطلب یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے اپنا گھر الگ کرلیا تو اپنی زبان کو بھی وہی سنبھالیں۔ ہندوؤں کی لسانی تنگ نظری کے بارے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ وہ تھا جب ہندو فارسی اور عربی کے عالم ہوا کرتے تھے لیکن اردو ہندی تنازع اور سیاسی حالات نے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کردی اور وہ تعصب سے مغلوب ہوگئے۔ وہ اردو سے برگشتہ ہوکر ہندی کے حامی ہوتے گئے۔''(۲۹)

ہماری ڈیڑھ سوسالہ سیاسی اور ملّی تاریخ شاہد ہے کہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کی تمام قومی اور سیاسی جدوجہد کے دوران اردو اور صرف اردو کو ہی بین العلاقائی اور بین الصوبائی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس نے سب کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرویا۔ محبت اور یگانگت کا سبق سکھایا۔ سیّد احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد، تحریکِ دیوبند، تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ ندوۃ العلماء، تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور تحریکِ اتحاد عالمِ اسلامی، ان سب اسلامی تحریکوں میں ذریعۂ اظہار اردو ہی بنی رہی۔ مسلمانوں نے پشاور و کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور سندھ بلوچستان سے لے کر بنگال اور آسام تک اپنے قول و فعل سے اردو کی اس عمومی اور اجتماعی حیثیت کو جانا اور مانا ہے۔ اس لئے سردار عبدالرب نشتر نے کہا تھا:

''واقعاتی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ حیثیت اردو ہی کو حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی قومی زبان بنے۔ جن چیزوں نے ہم میں یہ احساس، یہ جذبہ اور یہ ذوق وشوق پیدا کیا تھا کہ اپنا علیحدہ وطن بنائیں ان میں سے ایک اہم چیز یہ تھی کہ ہم اردو کو اغیار کی دست برد سے محفوظ کردیں۔''(۳۰)

مدیر ''ادبی دنیا'' مولانا صلاح الدین احمد اردو زبان کے تاریخی کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مسلمانانِ ہند کا باہمی اتحاد جس قدرِ مشترک پر قائم ہے، وہ ہماری قومی

زبان اردو ہے، جو نہ صرف ہمارے ارتباط باہم کا سب سے مؤثر اور زندہ ذریعہ ہے بلکہ ہندوستان میں ہمارے ہزار سالہ تمدّن کی امین اور ہماری مذہبی، ثقافتی اور علمی روایات کی سرمایہ دار ہے۔ اردو ہماری قومی زندگی اور ہماری ملّی تہذیب کا نشان بن کر نمودار ہوئی اور ہم نے اسلام کے بعد اردو کو اپنی عزیز ترین تمناؤں کا مرکز بنایا۔ پاکستان کا ایوانِ عظیم الشان ہم جن محکم ستونوں پر قائم کرنا چاہتے تھے، وہ تعداد میں چار تھے: اسلام، اتحاد، آزادی اور اردو۔ اور جب ہمارے قائداعظم نے ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف پکارا تھا تو ایوانِ مملکت کے انھی چار ستونوں کی نشان دہی فرمائی تھی۔" (۳۱)

اردو کا تحفظ برِصغیر میں مسلمانوں کی جنگ آزادی کا ایک مستقل حصہ رہا ہے اور یہ تاریخی اہمیت اس زبان کا طرۂ امتیاز ہے۔ تحریک پاکستان میں اردو، پاکستان کی قومی زبان کے طور پر مطالبۂ تقسیم کے بعد دوسرا اور شاید سب سے بڑا ثقافتی مطالبہ، نعرہ اور وعدہ رہی ہے۔ تحریکِ پاکستان کا محرکِ اوّل اگر اسلام تھا تو محرکِ دوم اردو زبان تھی اور قائداعظم کو بھی دیگر اکابر کی طرح اس حقیقت کا بخوبی علم تھا۔ اردو زبان کی عظمت یہ ہے کہ برِصغیر پاک و ہند میں اس نے تاریخ لکھنے کا نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس لئے بھی کہ اردو نے صرف ہماری تاریخ بنانے ہی کا نہیں بلکہ پاکستان کا جغرافیہ بھی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان کے حال اور مستقبل میں ثقافتی شیرازہ بندی، سیاسی استحکام، وحدت، ہم آہنگی، یک جہتی اور ریاستی تشخص کی ضامن اردو زبان ہی ہے۔

میرے نزدیک اردو زبان، اس کا رسم الخط اور املاء عقیدے کا مسئلہ ہے۔ برصغیر میں اردو کسی کی مادری زبان ہو یا نہ ہو، یہ ہر مسلمان کی مذہبی اور ثقافتی زبان ضرور رہے اور عربی و

فارسی کے بعد اسلامیانِ ہند کی واحد ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برِصغیر پاک و ہند کا مسلمان اس زبان کی حق تلفی پر جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس کا جذباتی ہونا ایک فطری امر ہے۔ کیوں کہ اردو اس کے بزرگوں کی عزیز ترین کمائی ہے جسے سینچتے، پروان چڑھاتے اور دیس بہ دیس نشر و اشاعت کرتے انھیں صدیاں گزری ہیں اور وہ اپنے بزرگوں کی اس مقدس میراث کا جائز وارث ہے۔

## حواشی و حوالہ جات

۱۔ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ O سورہ الروم: ۲۲
(اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے)

۲۔ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ O سورۃ الرّعد: ۲۸ (خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔)

۳۔ النووی، محی الدین ابوزکریا یحییٰ، الاربعون النُوَوِيَّة و شَرحُها، ص ۵۹

۴۔ محمد حسین آزاد، مولانا، سخن دانِ فارس (لاہور: بک ٹاک ٹمپل روڈ، ۲۰۰۶ء) ص ۴۵

۵۔ قریشی، ڈاکٹر محمد اسحاق، برصغیر پاک و ہند میں عربی نعتیہ شاعری (لاہور: مرکز معارفِ اولیاء محکمہ اوقاف حکومت پنجاب، ۲۰۰۲ء) ص ۴۷۶

۶۔ خطباتِ رشید احمد صدیقی۔ مرتبین: مہر الٰہی ندیم (علیگ)/لطیف الزمان خان (کراچی: مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ، ۱۹۹۱ء) ص ۸۸

۷۔ بخاری، ڈاکٹر سہیل، لسانی مقالات، حصہ دوم (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء) ص ۴۱۷

۸۔ ............ایضاً............، ص ۴۱۸

۹۔ تارا چند، ڈاکٹر، ہندوستانی زبان کا مسئلہ، (۱۹۴۴ء)

۱۰۔ لسانی مقالات، حصہ دوم، ص ص ۴۱۵-۱۶

۱۱۔ ............ایضاً............، ص ۴۱۶

۱۲۔ ہندوستانی زبان کا مسئلہ، (۱۹۴۴ء)

۱۳۔ F.E Keay, A History of Hindi Literature, P-80

۱۴۔ محمد اکرام، شیخ، پاکستان کا ثقافتی ورثہ (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۱ء) ص ص ۱۲-۱۳

۱۵۔ ذکریا، ڈاکٹر رفیق، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء) ص ص ۳۹۶-۹۷

۱۶۔ ماہ نامہ اردو (جوبلی نمبر) کراچی: نومبر ۱۹۵۳ء ص ۹

۱۷۔ Separatism Among the Indian Muslims, P-44

۱۸۔ The Moslem Chronicle, May 30, 1903

۱۹۔ فاروقی، پروفیسر ڈاکٹر طاہر، ہماری زبان-مباحث و مسائل (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص ۹۴

۲۰۔ محمد منور، پروفیسر، پاکستان-حصارِ اسلام (لاہور: گوہر سنز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء) ص ۲۱

۲۱۔ ............ایضاً............، ص ۲۳

۲۲۔ پیام شاہ جہان پوری، تاریخ نظریہ پاکستان (لاہور: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، ۱۹۷۰ء) ص ۳۱۹

۲۳۔ دیکھیے رسالہ اردو قومی زبان نمبر، ۱۹۳۸ء

۲۴۔ دیکھیے جمیل الدین احمد، Writings and Speeches of Muhammad Ali Jinnah جلد دوم (لاہور: ۱۹۷۴ء)

۲۵۔ بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین، اقبال کے آخری دو سال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء) ص ۳۷۶

۲۶۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۲/اپریل ۱۹۳۷ء

۲۷۔ ہماری زبان-مباحث و مسائل ص ۴۰

۲۸۔ پاکستان-حصارِ اسلام، ص ۲۶

۲۹۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، ابوالکلام آزاد-امامِ عشق و جنوں (لاہور: مکتبہ جمال، اردو بازار، ۲۰۰۹ء) ص ۵۰

۳۰۔ ہماری زبان-مباحث و مسائل، ص ۴۹

۳۱۔ صلاح الدین احمد، مولانا، مضمون ''ار[illegible]'' [illegible] مقالات [illegible] ہمدرد مرتبہ حکیم محمد سعید (لاہور: مکتبہ جدید ۱۹۶۹ء) ص ۲۰۱